

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی موتمر ثانی منعقدہ ۱۳۸۵ھ - مئی ۱۹۶۵ء کی ایک ضخیم رپورٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ”یہ مجمع“ جامعہ ازہر کے تحت قائم کیا گیا ہے اور اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے مسلمان علماء اور مفکرین مدعو کئے جاتے ہیں۔ ”مجمع“ کی موتمر اول ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوئی تھی۔ موتمر ثانی میں جیسا کہ اس رپورٹ میں درج ہے، ساتیس ممالک کے کوئی ساٹھ کے قریب ارکان وفد نے شرکت کی، جن میں پاکستان سے بھی چار علماء شامل تھے۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کی موتمر ثانی میں جو بحثیں ہوئیں، زیر نظر رپورٹ میں انہیں جمع کیا گیا ہے تاکہ وہ اسلامی مسائل سے دل چسپی رکھنے والوں کے سامنے آجائیں۔

”مجمع“ کے امین عام (سیکرٹری جنرل) نے پیش لفظ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ زیر بحث مسائل میں غور و فکر کے بعد موتمر جن نتائج پر پہنچی ہے، ان کی نوعیت اجماع کی نہیں کہ اس کے بعد بحث کرنے والوں کے سامنے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ یہ دراصل ایک کوشش ہے دین اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بدون دین میں کوئی کمی اور زندگی پر کسی زیادتی کرنے کے۔ پس بحث کا دائرہ وسیع ہے، ہر اس شخص کے لئے جس کو اللہ نے شرح صدر عطا کیا اور دین کی سمجھ اور تفہم دیا ہے۔

فضیلۃ الدکتور محمود حب اللہ نے جو ”مجمع“ کے امین عام ہیں، اپنے پیش لفظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ آج جو مشکلات ہمیں درپیش ہیں، اور جن پر موتمر میں بحثیں ہوئیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر ایک تو الشورس اور میہ (التابین) ہے اور دوسری مشکل معاملات ذر کی ہے۔ یہ مشکل ہر مسلمان کو خواہ وہ کہیں بھی ہو، اور خواہ وہ جہاں بھی جائے پیش آتی ہے، اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کسی لین دین کے اسے اس کی حلت یا حرمت کے متعلق شرعی

حکم بیان کر دینا کافی نہیں۔ بلکہ آج ایک مسلمان کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ شرعی حکم کے ساتھ ایک متبادل نظام کا اضافہ ہو، جس کا اسلام سے اثبات ہوتا ہو اور اس سے متوقع فائدہ بھی حاصل ہو۔ چنانچہ یہ بات اس کی متقاضی ہے کہ تہذیب اور مفتی کے پہلو پہلو مالیات و اقتصادیات کے ماہر وغیرہ بھی ہوں، جو ان امور کا تجربہ اور سمجھ رکھتے ہوں۔ اس طرح ہی وہ مقصد پورا ہو سکے گا، جس کے لئے یہ اسلامی ادارہ بنایا گیا ہے۔

اور یہ اس لئے کہ امین عام موصوف کے الفاظ میں آج علمائے مسلمین کو جن مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس سے پہلے اس شکل میں علمائے مسلمین کو جو امت اسلامیہ کے لئے اس عظیم علمی ورثے کو چھوڑ گئے ہیں، ان سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔

جناب حسین شافعی نائب رئیس الجمہوریہ جمال عبدالناصر کی طرف سے مؤتمر میں شریک ہونے والوں کا خیر مقدم کیا اور منجملہ اور باتوں کے انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں یہ الفاظ کہے :-
”كما أخذت البلاد بأسباب تخطيط الأسرة بغرض مواجهة مشكلة تزايد السكان ودرا
للمنظر الانحجار السكانية ومحاربة الفقر في منبعه ومهدته“۔

اسی طرح اس سرزمین نے خاندانی منصوبہ بندی کے اسباب و وسائل اختیار کئے ہیں تاکہ کثرت آبادی کی مشکل سے عہدہ برآ ہو جا سکے۔ زیادہ آبادی کے پھٹ پڑنے کے خطرات کو روکا جا سکے اور فقر و غربت کا اس کے اصل منبع اور مرکز ابستدائی میں مقابلہ کیا جائے

جناب حسین شافعی نے اپنی حکومت کی بعض اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے بچوں (الطفولة) اور ماؤں (الامومة) کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا ہے، اس کے ضمن میں یہ کہا :-

”وقامت الدولة باحترام حقوق المرأة في المجتمع ومساواتها بالرجل في حدود
الشرعية الغراء واستقاطا بقايا الاغلال التي تعوق حركتها الحرة حتى تستطيع أن تشارك بعمق
وإيجابية في صنع الحياة وأن تكون في بيتها وفي مجتمعاتها قادرة على أن تسهم في بناء المجتمع على
أساس من القوة والفضيلة“۔

(حکومت معاشرے میں عورت کے حقوق کے احترام اور مرد سے اس کے مساوات کو بروئے کار لائی اور
یہ سب شریعت غراء کی حدود کے اندر رہ کر کیا گیا ہے) © rasailojaraid.com کی آزادانہ نقل و حرکت

کو روکتی تھیں، نوٹ دی گئیں تاکہ وہ پوسے انہماک اور ایجابی طور پر زندگی کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہو سکے۔ اور وہ اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں قوت اور فضیلت کی اساس پر معاشرے کی تعمیر پر قادر ہو۔

پھر اس کے بعد موصوف نے اپنی اشتراکیت کی تعریف کی اور کہا ”ان اشتراکیتنا انعال“ لا افعال“ اور یہ کہ اشتراکیت مادی ٹھوس وجود اور جدید قدریں رکھتی ہے، اور یہ ہیں: عدل اجتماعی، کفالت اور زیادہ پیداوار، معنوی اور روحانی قوتوں میں اضافہ، امن کی دعوت، واضح اور معین مقاصد اور ملک کے ہر باشندے کے لئے صحت، علم اور روزگار کا حق۔

”مجمع البحوث الاسلامیہ“ کی دوسری اور اس سے قبل پہلی مؤتمر میں پاکستان سے جو علمائے کرام تشریف لے گئے تھے، ان میں کئی ایک ایسے بزرگ ہیں، جنہوں نے اپنا وظیفہ حیات ہی یہ بنالیا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی اور عالمی قانون کے سلسلے میں حکومت پاکستان کی طرف سے جو قوانین نافذ ہوئے ہیں، ان کی مخالفت کریں، ان حضرات کے رسالے، خطبے، وعظ اور درس صرف انہی امور کے لئے وقف ہیں۔ یہ ان قوانین پر صبح و شام برستے ہیں۔ انہیں قرآن و سنت کے خلاف بتاتے ہیں۔ ان کی مخالفت میں جو جی میں آتا ہے، کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قوانین کو نافذ کرنے والی حکومت ان حضرات کی منافرت انگیزی کا نشانہ بنتی ہے۔ اس میں ہمارے یہ بزرگ اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے نام سے ہوتا ہے اور بزرگم خولیش اعلائے کلمتہ اللہ کی خاطر ہوتا ہے۔

لیکن یہی بزرگ جو صدر ایوب کی حکومت کو مطعون کرتے اور اس کے خلاف اسلام کے نام سے عوام کو اشتعال دلاتے نہیں تھکتے، صرف اس بناء پر کہ اس نے خاندانی منصوبہ بندی اور عالمی قوانین کو نافذ کیا ہے، صدر ناصر کی حکومت کی دعوت پر قاہرہ تشریف لے جاتے ہیں، وہاں اسی مؤتمر میں شریک ہوتے ہیں، جہاں اس حکومت کا نائب صدر خاندانی منصوبہ بندی کے نفاذ کو اپنی حکومت کا ایک قابل تعریف کارنامہ بتاتا اور عورتوں کی آزادی کو نئے معاشرے کی تشکیل کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ اور یہ صرف زبان سے نہیں، بلکہ صدر ناصر کی حکومت ”تجدید پسندی“ اور ”تجدد پرستی“ میں اتنی آگے ہے اور مصری معاشرہ ہمارے ان بزرگوں کے ”شرعی پردے“ کو اتنا پیچھے چھوڑ گیا ہے کہ پاکستان والوں کو اس تک پہنچنے میں معلوم نہیں کتنے سال لگیں۔ یعنی مصر میں اگر صدر ناصر کی حکومت خاندانی منصوبہ بندی اور عالمی قوانین نافذ کرتی ہے، تو وہ قابل گرفت نہیں، بلکہ مدوح ہی رہتی ہے۔ اور یہی اقدامات اگر صدر ایوب کی حکومت نے خاندانی منصوبہ بندی کو نافذ کر کے اس کے خلاف

مخالفت و منافرت کا طوفان کھڑا کر دیں۔ اور انہیں یہاں خدا نخواستہ اسلام کا سفینہ ڈوبا نظر آئے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

حضرات علماء میں سے بعض بزرگ وہ ہیں جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ گویہ یہ ثابت کرنے میں گزرا ہے کہ اسلام کے نزدیک ڈیوکریسی ناجائز ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت شرک کی ہے۔ لیکن اب وہ جمہوریت اور وہ بھی پارلیمانی جمہوریت کے قیام کو ہی اپنی اسلامی دعوت کا مقصد قرار دیتے ہیں۔ موصوف آج کل اپنے اس بنیادی تضاد کو یہ کہہ کر دور کرنے میں کوشاں ہیں کہ جمہوریت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو اسلام میں ہے اور ایک وہ ہے جو مغرب میں ہے۔۔۔
.. یعنی جمہوریت کے اسلامی تصور میں مالکیت اللہ کی ہوتی ہے اور حکومت عوام کی مرضی سے بنتی ہے تاکہ وہ احکام الہی کے مطابق ملک کا نظام چلائے یعنی اسلامی جمہوریت میں حکومت جس طرح عوام کی مرضی کے خلاف ان پر نہیں ٹھونس جاسکتی، اسی طرح وہ خدا کی مرضی کے خلاف نظام نہیں چلا سکتی۔۔۔

موصوف فرماتے ہیں ”یہاں خدا کے قانون میں جو حرام ہے، وہ حرام ہی رہے گا اور جو حلال ہے، وہ حلال رہے گا۔ حلال کو حرام کرنے کا حق کسی کو نہیں اور اللہ نے جسے حرام ٹھہرایا ہے، اسے حلال کرنے کا کوئی مجاز نہیں“۔ موصوف نے جمہوریت کی یہ تشریح اسی راولپنڈی شہر میں ۱۴ اپریل کو کی ہے۔

نظر تیار ”اللہ کی مالکیت“ اسی جگہ مسلم، لیکن عملی زندگی میں اس کی تطبیق کیسے ہوگی؟ پھر احکام الہی کا تعین کون کرے گا۔ نیز خدا کے قانون میں کون سی چیز حرام ہے اور کون سی حلال، اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کا کون مجاز ہے۔ یہاں ہم ان چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کی حرمت اور حلال بالکل ظاہر ہے۔ بلکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو مختلف فیہ ہیں۔ مثال کے طور پر انہیں بزرگ سے ۱۴ اپریل کی مجلس میں سوال کیا گیا کہ ”اسلام میں انفرادی مالکیت کی حد کیا ہے؟“ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا:۔ ”اسلام نے انفرادی ملکیت پر کوئی حد عائد نہیں کی بلکہ اس کے حصول کے طریقوں پر پابندی لگائی ہے۔ اگر آدمی شریعت کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو جتنا چاہے، کما سکتا ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں....“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انفرادی ملکیت کو محدود کرنا اللہ کے قانون میں حرام ہے اور اس کا لامحدود رہنا ہی اللہ کے قانون میں حلال ہے۔ اور اگر ایک جمہوریت انفرادی ملکیتوں کو محدود کرتی ہے تو کیا وہ اپنے اس فعل سے غیر اسلامی ہو جائے گی؟

عرض اس طرح کے سینکڑوں سوالات اور جوابات کے لیے اس سلسلے میں۔ اب اس کا فیصلہ کون

کرے کہ فلاں اقدام اللہ کے قانون میں حرام ہے اور فلاں حلال، مسیحیوں کے کیتھولک فرقے میں تو اس کا فیصلہ پوپ اور اس کے بشپ کرتے ہیں کیا ہمارے یہ بزرگ اپنی ”اسلامی جمہوریت“ میں اس قسم کا کوئی کلیسائی نظام چاہتے ہیں؟

یہ بحث تو بیچ میں یوں ہی آگئی۔ ہم دراصل ان بزرگ اور ان کی جماعت سے صرف یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ آپ حضرات پاکستان کی موجودہ حکومت سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ جمہوریت کے اصولوں پر عامل نہیں۔ آپ کا مطالبہ ہے کہ یہاں اس طرز کی جمہوریت نافذ ہو، جو آپ کے نزدیک صحیح جمہوریت ہے۔ بقول آپ کے ”یہ عوام کا حق ہے۔ کہ وہ اپنے ملک کے معاملات میں بولیں۔ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور اپنے ووٹ سے حکومت کو منتخب کریں“۔۔۔ آپ حضرات کو موجودہ حکومت سے یہ شکایت ہے اسی لئے آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس سے کسی قسم کا سروکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔

لیکن اس ملک سے کچھ دور سعودی عرب کی جو حکومت ہے، کیا وہ جمہوری ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس حکومت سے ہمارے ملک کے بہت اچھے تعلقات ہیں اور ہم بھی اس حکومت اور اس کے بیدار مغز اور روشن خیال فرمانروا کو پاکستان کا سچا ہمدرد اور محب صادق مانتے ہیں۔ اس سے قطع نظر، یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔ کہ جس طرح کی جمہوریت کو آپ لوگ اسلامی جمہوریت مانتے ہیں، کیا آپ کو اس طرح کے آثار و قرائن وہاں ملتے ہیں۔

پاکستان کے نظام حکومت کو آپ کتنا بھی غیر جمہوری بتائیں، پھر بھی یہاں عدالتوں کی بالائری موجود ہے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے سامنے بجٹ پیش ہوتے ہیں، ایک آزاد اور بالآخر آئین و اصول کا محکمہ ہے اعلیٰ ملازمتوں کے لئے سپیک سروس کمیشن ہے، جس کی مرضی کے بغیر کسی اعلیٰ عہدے پر کوئی فائز نہیں ہو سکتا۔ انتخابات بھی ہوتے ہیں۔ انتخابات کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ پریس آپ کے خیال کے مطابق آزاد نہیں، لیکن اتنا پابند بھی نہیں کہ آپ لوگوں کی تقریریں نہ چھپیں۔ سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ ان کے اجتماع ہوتے ہیں اور وہ حکومت کے خلاف قراردادیں پاس کرتی ہیں۔ اب جہاں تک ہماری معلومات بتاتی ہیں، سعودی عرب میں جمہوری نظام کے ان بنیادی لوازم میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ اور ظاہر ہے اس کے معقول اسباب ہیں، لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ جس جمہوریت کے حامی اور نامکمل ہونے کی وجہ سے آپ صدر ایوب کی حکومت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں اس کا ایک ادنیٰ شائبہ تک بھی ہمیں سعودی عرب کی حکومت میں نظر نہیں آتا لیکن اس کے باوجود آپ اس حکومت سے تعاون کرتے ہیں۔ اس کی دعوت پر آپ نے سعودی عرب میں جہاد کیا ہے اس کی تعریف میں آپ اور آپ کے ساتھی

برابر رطب اللسان رہتے ہیں، غرض نہ صرف اس ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی آپ اس حکومت کے حق میں پروپیگنڈا کرتے نہیں تھکتے۔

اب اگر آپ لوگ صدر ایوب کی حکومت سے واقعی اس کی عدم جمہوریت سے ناراض تھے، تو منطقی اقتضا تو یہ تھا کہ آپ سعودی عرب کی حکومت کو اپنا آئیڈیل نہ بناتے اور نہ اس کی حمایت میں اس قدر سرگرم کارموتے۔ وہ حکومت ہزار اچھی ہو، لیکن وہ جمہوری ہرگز نہیں۔

دراصل صدر ایوب کی حکومت کی مخالفت کی وجہ نہ اسلام ہے اور نہ جمہوریت۔ آپ کے اسلام میں اتنی لوح ہے کہ وہ ہر ضرورت کے وقت بدل سکتا ہے، باقی رہی جمہوریت، جو شخص حاکمیت عوام کا اصلاً مخالف ہو، اسے اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ حضرات، جن کا قبلہ مفسود قاسر ہے، خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین کے اتنے ہی شدید مخالف ہیں، جتنے یہ حضرات جو سعودی عرب کو اپنا سب کچھ مانتے ہیں اور ان دونوں گروہوں کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ حالانکہ دونوں اسلام کے علمبردار بننے ہیں۔ دونوں اسلامی نظام کے قیام کے مدعی ہیں۔ اور دونوں کا دعویٰ ہے کہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔

یہ قصہ جیسا کہ اوپر عرض ہوا ہے، نہ اسلام کا ہے نہ جمہوریت کا۔ یہ دونوں گروہ عوام مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کی سادہ دلانہ قدامت پسندی اور روایتی مذہب سے جذباتی وابستگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مذہب کے نام سے سیاست کاری میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ”حاضرین“ کم سے کم محنت سے میسر آجاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات خدا اور رسول کے ترجمان بن کر عوام کے سامنے آتے ہیں، اس لئے انہیں وہ کچھ کہنے کا حق مل جاتا ہے جو عام سیاست دان نہیں کہہ سکتے۔

اگرچہ یہ بات بڑی تلخ ہے، لیکن اسے کہہ بغیر چارہ نہیں کہ جب تک قومی زندگی سے اس قسم کی مذہبی سیاست ختم نہیں کی جاتی، اس ملک میں صحت مند سیاست کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔ اس مذہبی سیاست کی کم و بیش وہی حیثیت ہے جو ادب میں ایک خاص قسم کی صنعت کی ہوتی ہے کہ گو اس پر لوگ لکے پڑتے ہیں اور اس کی کتابیں دھڑا دھڑکتی ہیں لیکن اس کے باوجود حکومتوں کو ان پر قدغن لگانی ہی پڑتی ہے

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے، اس مذہبی سیاست کے خلاف حق و باطل کے حق و باطل سے ہی لوگ ہیں

جنہیں بعض سازگار حالات نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ علمائے کرام کی ایک کثیر تعداد ایسی موجود ہے، جو اس قسم کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر دین کی خدمت کرتے ہیں اور جب ضرورت سمجھتے ہیں، حاکموں کو بھی ٹوکتے ہیں اور ان پر تنقید بھی کرتے ہیں، لیکن سیاست کاری سے وہ دُور ہیں۔

۱۰۔ ۱۵ اپریل تک پشاور میں علمائے کرام کا ایک اجتماع (سیمینار) ہوا، جس میں بعض ممتاز علماء کے علاوہ خاص طور سے تحصیل پشاور کے دیہات کے ائمہ اور خطباء شریک ہوئے، اس اجتماع کی دعوت خود علماء کی طرف سے دی گئی تھی۔ البتہ اس کا انتظام پشاور یونیورسٹی ٹاؤن میں واقع پاکستان اکیڈمی برائے ترقی دیہات کی شاندار مارت میں کیا گیا۔ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی مالی اعانت اور ایڈیٹری مرکز کی کوششوں سے علماء کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا، جو پشاور میں منعقد ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہر لحاظ سے بڑا کامیاب رہا۔

اس اجتماع میں مقالات پڑھے گئے، جن میں یہ بتایا گیا کہ ائمہ اور خطباء دیہات میں اپنی مفوضہ دینی خدمات کے ساتھ ساتھ خود اپنی اور عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور ملک کو مٹوس تعمیری راہوں پر آگے بڑھانے میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ علماء حضرات پشاور یونیورسٹی کے تعلیمی و سائنسی شعبوں اور بعض صنعتی اداروں میں بھی گئے۔ اور انھوں نے پاکستان کا بنیادار السلطنت اسلام آباد بھی دیکھا۔

پاکستان کی صحیح اسلامی اصولوں اور جدید ترقی یافتہ طریقوں پر تعمیر صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ علماء، ائمہ اور خطباء بھی اس میں برابر حصہ لیں، امیر ہے پشاور کا یہ اجتماع علماء اس راہ کی نشان دہی میں بڑا مفید ثابت ہوگا۔

آج کئی ایک اسلامی ملکوں میں قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حضرات علماء، ائمہ و خطباء مساجد کو عملاً حصہ لینے کے قابل بنانے کے لئے مناسب اقدامات کیے جا رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہاں دینی درس گاہوں کے نصاب تعلیم میں کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں، تاکہ ان سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے لئے دینی خدمت کے ساتھ قومی زندگی میں شریک ہونے کے بھی وسیع مواقع ہوں۔ پاکستان کو جلد با بدیر یہ کرنا ہوگا اور اگر وہ اسے جد کرے تو اس کی قومی ترقی کی منزل اور قریب آسکے گی۔